چاند گہن

بوجی سوتے سوتے چونک اٹھیں۔ پہلے تو یوں معلوم ہوا جیسے کوئی کھلکھلا کر ہنس رہا ہے۔ پھر ایسا سنائی دیا۔ جیسے کوئی کسی کے رونے کی نقل اتار رہا ہے۔ بوجی دم سادھے پڑی رہیں۔ انہوں نے کئی مرتبہ کروٹ لینے کی نیت باندھی لیکن ارادے کے باوجود انہیں اپنے جسم کو جنبش دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ انہوں نے گردن کی طرف بھی ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تھا انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی گردن پر کوئی چیونٹی بہت آہستہ آہستہ رینگ رہی ہے وہ گردن کھجانا چاہتی تھیں لیکن ہاتھ کو جنبش نہ ہوئی۔ ان کا جسم لکڑی بن گیا تھا۔ انہیں یوں لگ رہا تھا کہ ان کی ساری رگیں ایکا ایکی سن ہوگئی ہیں اور ان کے بدن کو کسی نے شکنجہ میں کس دیا ہے وہ ہلنا چاہتی تھیں اور ہل نہیں سکتی تھیں۔ البتہ ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ سارا جسم سن تھا اور دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور کان ان بے نام پراسرار آوازوں کو گرفت کرنے میں مصروف تھے جن کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ پھر ایکا ایکی درخت کے پتے اک ذرا کھڑکھڑائے اور ایک پرندے کے اڑنے کی آواز پیدا ہوئی جو دور ہوتی گئی' دور ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بالکل معدوم ہوگئی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ بوجی بہت دیر تک دم بند کئے آنکھیں میچے لیٹی رہیں۔ اس وقت اگر کوئی چراغ لے کر انہیں دیکھتا تو عجب حالت میں پاتا۔ چہرے کا رنگ پیلا ہلدی پڑ گیا تھا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ گویا ان کی روح قبض ہوگئی ہے اور خالی جسم کا ڈھانچہ پڑا ہے جس میں ملک الموت کی کسی چوک کی وجہ سے ایک دھڑکتا تھرا تا دل پڑا رہ گیا ہے۔ بڑی دیر کے بعد ان کی ذرا جان میں جان آئی۔ ہمت کر کے انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ پیپل کا درخت سر نیوڑھائے چپ چاپ کھڑا تھا اس کے پتے ایسے گھنے نہیں تھے۔ پھر بھی انہیں یہ وہم ہوا کہ کوئی ان میں چھپا بیٹھا ہے۔ یہ کوئی' کون ہوسکتا ہے۔ کوئی انسان یا کوئی اور مخلوق' یہ ان کی سمجھ میں تو اس وقت آتا جب وہ سمجھنے پہ مائل ہوتیں۔ بس انہیں تو کسی کی موجودگی کا ایک مبہم سا احساس تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد انہیں یوں محسوس ہونے لگا کہ اس کی ہر شاخ میں کوئی چھپا بیٹھا ہے اور انہیں جھانک جھانک کر دیکھ رہا ہے۔ بار بار سر نکال کر انہیں دیکھتا ہے اور پھر جلدی سے پتوں کی اوٹ میں ہو جاتا ہے۔ دو مرتبہ تو انہوں نے واقعی ایک کالے سے سر کو تیزی سے پتوں کی اوٹ میں گم ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وسوسوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ ہزاروں طرح کے گمان اور سینکڑوں قسم کے وہم ان کے اندر گھڑ دوڑ کر رہے تھے۔ وہ الٹے ہاتھ پر کروٹ لیے پڑی تھیں اور سبطین کی چارپائی ان کے سیدھے ہاتھ پر تھی۔ لیکن اس کے باوجود انہیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اس چارپائی کے قریب کیا ہو رہا ہے۔ چارپائی کے سرہانے

کوئی چیز رینگ رہی تھی۔ اس کا کوئی جسم نہیں تھا۔ کوئی شکل وصورت نہیں تھی۔ بس ایک سیاہ سایہ تھا جو آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس سائے نے واقعی ایک جسم کی شکل اختیار کر لی۔ مگر یہ ایک بے شکل جسم تھا۔ اس کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس میں پیچ وخم نہیں تھے۔ بس ایک ٹھوس جسم تھا اور یہ جسم سبطین پر جھکا جا رہا تھا۔ بوجی نے گھبرا کر ایک ساتھ کروٹ بدلی۔ مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سبطین بڑے اطمینان سے سو رہا تھا۔ اس کی اطمینان کی نیند کو دیکھ کر بوجی کی گھبراہٹ اک ذرا کم ہوئی۔ اجلا سفید بستر' پھولوں سے کڑھا ہوا سفید نرم تکیہ سبطین اطمینان سے سو رہا تھا۔ ایک سفید چادر اس نے اوڑھ رکھی تھی۔ اس سفید بستر اور سفید چادر کو دیکھ کر بوجی کا تصور پھر بے لگام ہو گیا اور سبطین کا چارپائی کی شکل بدلنی شروع ہو گئی۔ لیکن انہوں نے بہت جلد اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ محض ایک دل دہلانے والے واہمہ سے بچنے کی خاطر انہوں نے سبطین کی چارپائی سے رخ پھیر کر گلشن کی چارپائی پر نظریں مرکوز کر دیں گلشن کی چارپائی ان کی پائنتی کی سمت میں بچھی ہوئی تھی۔ عجب قماش کی عورت تھی۔ سوتے جاگتے یکساں غل مچاتی تھی۔ پھر بھی اسے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ بوجی اس کے حلق کی داروغہ بن گئی ہیں۔ زبان ہلانے نہیں دیتیں۔ اس وقت وہ بڑے زور شور سے خراٹے لے رہی تھی۔ خرخر کی آواز سے سارا صحن گونج رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے آواز نے یکا یک پلٹا کھایا اور فٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ بس یوں معلوم ہوا کہ چلتی گاڑی میں کسی نے یکا یک بریک لگا دیئے ہیں اور وہ ایک دھچکے کے ساتھ رک کر کھڑی ہو گئی ہے اور جس طرح ریل گاڑی کے رک جانے پر اسٹیم کی آواز نکلا کرتی ہے' کچھ اسی قسم کی آواز گلشن کے منہ سے نکل رہی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اور سوں سوں کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہوا تیزی سے منہ میں داخل ہوتی ہے اور کسی وجہ سے پریشان ہو کر تیزی سے نتھنوں کے راستے نکل آتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ عبوری کیفیت ختم ہوئی اور خراٹوں کی آواز پھر باقاعدگی سے بلند ہونے لگی۔ البتہ اس مرتبہ آواز میں کچھ ٹھہراؤ تھا۔ لیکن آثار بتا رہے تھے کہ یہ محض ایسا ٹھہراؤ ہے جو ہر عمل کے آغاز میں ہوا کرتا ہے۔ اس کی تان بالعموم اسی نقطہ پر جا کر ٹوٹے گی جس نقطہ پر پہلے جا کر ٹوٹی تھی۔ اتنے میں گھڑونچی پر کچھ کھٹکا ہوا۔ گھڑے کا ڈھکن زمین پر گرا اور کوئی چیز دھم سے نیچے کو دی۔ بوجی نے ہڑبڑا کر گھڑونچی کی طرف دیکھا۔ ایک بلی بڑے مضمحل سے انداز میں ٹہلتی ہوئی سبطین کی چارپائی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بوجی اسے زور سے ڈانٹنا چاہتی تھیں لیکن ان کی آواز بھنچ کر رہ گئی۔ ان کی زبان سے ایک دبی سی آواز نکلی ''بلی'' اور بلی سٹاک سے موری میں گھس گئی۔

بوجی پر یہ کیفیت جانے کب تک طاری رہی۔ وہ تو اس وقت چونکیں جب مرغے نے ڈربے کے اندر اپنے پر پھڑ پھڑا کر زور سے ککڑوں کوں کی آواز بلند کی۔ مرغے کی اذان نے پورے ڈربے میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی۔ مرغیوں کی کٹ کٹ اور پروں کی

پھڑ پھڑاہٹ کے مدھم شور کو سن کر کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی سیال چیز ابھرتی چلی جارہی ہے اور تھوڑی دیر میں ڈبے کی چھت چٹخ گی اور یہ سیال متحرک مادہ یوں ابل پڑے گا۔ جیسے حضرت نوح کے زمانے میں طوفان کا پانی تنور سے ابل پڑا تھا۔ کا بک کے ایک دوخانوں سے بھی اس قسم کا بہت دیما سا شور سنائی دیا تھا۔ اس شور میں ننھے منے جھانجھوں اور گھنگھروؤں کی لطیف سی جھنکار بھی ملی ہوئی تھی۔ ایک خانے سے یا غفور یا غفور کی صدائیں آ رہی تھی۔ جیسے گائے کا دودھ دوہتے وقت ایک لطیف سی آواز کے ساتھ سفید سفید جھاگ اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ پتہ نہیں کہ یہ مرغ کی اذان کا اثر تھا یا اس وجدان کا جو قدرت کی طرف سے مرغوں کے ساتھ ساتھ کبوتروں کو بھی عطا ہوا ہے۔ پھر جب دور کی کسی سڑک پر اکے کے چلنے اور پیپل کے نیچے والے کوئیں میں ڈول پڑنے کی آواز آئی تو بوجی کو یقین ہوگیا کہ دن کے ہنگاموں کا آغاز ہوچلا ہے۔

حوائج ضروری سے فراغت پا کر انہوں نے وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہوگئیں صبح کی نماز بہت مختصر ہوتی ہے لیکن دعا بالعموم طویل ہوجاتی ہے۔ بوجی کی دعا میں مدعا تو بہت مختصر الفاظ میں بیان کیا جاتا تھا۔ لیکن وہ واسطے اتنے نبیوں' ولیوں اور اماموں کے دیتی تھیں کہ دعا خواہ مخواہ طویل ہوجاتی تھی۔ اور آج تو انہوں نے حد ہی کر دی۔ سجدے میں جانے کتنی دیر پڑی رہیں اور گڑگڑا کر دعائیں مانگتی رہیں۔ انہوں نے شاید سجدے میں ہی پڑے رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن وہ تو یہ کہئے کہ انہوں نے گلشن کی آہٹ سن لی اور انہیں محض اس منحوس راز کے اظہار کے لیے سجدے کی لذت سے کنارہ کرنا پڑا جس نے ان کے سینے میں کلبلی مچا رکھی تھی۔ انہوں نے سر اٹھایا اور جانماز کو لپیٹتے ہوئے کہنے لگیں۔ اری گلشن! تو نے سنی تھی آواز؟'' اور یہ کہتے کہتے ان کا روئے سخن گلشن کی بجائے آسمان کی طرف ہوگیا۔ الٰہی میرے بچے پہ رحم کیجیو۔ میں بڑی گنہگار ہوں۔ بارالٰہا'' گلشن بوجی کی بات اکثر ٹال بھی دیا کرتی تھی۔ لیکن اس وقت تو ان کے چہرے پہ ایسی سنجیدگی طاری تھی کہ اسے بھی سنجیدہ ہوجانا ہی پڑا۔ اس نے یہ تو بھانپ لیا تھا کہ معاملہ کچھ بہت زیادہ سنگین ہے۔ لیکن وہ اس کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھی اور کوئی ہوتا تو پٹ سے پوچھ لیتا۔ ''بوجی کیسی آواز؟'' لیکن اس قسم کے سنگین واقعات سے اپنی لاعلمی ظاہر کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ آخر بوجی خود ہی کھل گئیں۔

''اری پہلے تو میں یہ سمجھی کہ اڑوس پڑوس میں کوئی ہنستا ہوگا مگر میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ مگر جب اس نے رونے کی نقل اتاری تو میرا تو کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ نہ بی بی اس محلہ میں رہنا ٹھیک نئیں ہے۔ اللہ ہر بلا سے بچائے رکھے۔ جانے کیا ناگہانی آفت آنے والی ہے۔''

گلشن تو اشارے کو بھی سمجھتی تھی چل نکلی۔ ''اجی بوجی میں سمجھی کہ خواب دیکھ رئی اوں۔ میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ پٹ سے

میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے یوسمجھا کہ پڑوس میں کسی کا بچہ رووے ہے۔ اجی یہ کمبخت جانور تو بڑا منحوس ہووے ہے۔ جس شہر میں بولا ہم نے یوہی سنا کہ وہ شہر اوجڑ۔''

''اری چپ رہ گلشن۔ نابی بی اس گھر میں ایسا لفظ زبان سے مت نکالو۔'' بوجی خود غیر ارادی طور پر ایسے بدشگونی کے الفاظ ضرور کہہ جاتی تھیں۔ لیکن کسی دوسرے کو انہوں نے بری آواز نکالنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔

دراصل بوجی کا ماتھا تو اسی روز ٹھنکا تھا جب ان کی جوتی پہ جوتی سوار ہوگئی تھی۔ آنکھوں دیکھتے تو مکھی نہیں نگلی جاتی۔ گلشن اس کھلی ہوئی حقیقت کی تردید بھلا کیسے کر دیتی۔ وہ ان کی تشفی کے لیے صرف اس قدر کہہ سکی۔ ''اجی بوجی سفر تو سبوں کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ بس اوپر والے سے یہ دیا کرو۔ کہ وہ جو کرے اچھا کرے۔'' بوجی نے اس تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھا اور چپ ہو رہیں۔ لیکن جب انہوں نے آسمان پہ دمدار ستارہ دیکھا ان کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ یہ بات ان کی اماں جان نے اپنی خالہ بی سے سنی تھی۔ کہ جب ۵۷ء میں غدر پڑا تھا تو اس سے ایک مہینہ پہلے آسمان پہ روز شام کو دمدار ستارہ دکھائی دیتا تھا اور ۱۴ء کی جنگ تو خود انہیں بھی اچھی طرح یاد تھی۔ انہوں نے اس زمانے میں خود اپنی آنکھ سے متواتر سات دن تک آسمان پر دمدار ستارہ دیکھا تھا اور اس کے بعد انگریز اور جرمن میں وہ خون خچر ہوا کہ خدا کی پناہ۔ البتہ ستارے ٹوٹنے کی روایت صرف غدر سے مخصوص تھی۔ یہ روایت بھی انہوں نے اپنی اماں جان ہی سے سنی تھی۔ اب جب انہوں نے ایک رات کو تابڑ توڑ تین ستارے ٹوٹتے دیکھے تو انہیں بے ساختہ یہ روایت یاد آ گئی اور بولیں۔ ''اللہ اپنا رحم کرے تارے بہت ٹوٹ رئے ہیں۔'' گلشن نے جب اس تلمیح کی توضیح طلب کی تو انہوں نے بڑے عالمانہ انداز میں اس کی تفسیریوں کی تھی کہ جب دنیا میں کوئی بڑا واقعہ ہونے کو ہوتا ہے تو اللہ میاں اپنے فرشتوں سے مشورہ کرتے ہیں شیطان کنسوئیاں لینے آتا ہے۔ بس اس وقت پہرے والا فرشتہ اس کے پیچھے گرز لے کے دوڑتا ہے۔ یہ ستارہ جب ٹوٹتا ہے تو دراصل یہ گرز ہوتا ہے جو شیطان کے سر پہ پڑتا ہے۔ یوں کام کاج کے سلسلہ میں جب بوجی گلشن کو الزام دیتی تھیں تو گلشن ضرور ان کی تردید کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی نوکری چھوڑنے کی دھمکی بھی دے ڈالتی تھی۔ لیکن اس قسم کے الہیاتی مسائل میں تو وہ جھٹ ان پر ایمان لے آتی تھی۔ الو کے بولنے کے سلسلہ میں وہ بوجی پر صرف ایمان ہی نہیں لائی بلکہ کسی نہ کسی طرح اس نے اپنے آپ کو یہ یقین بھی دلا لیا کہ اس نے خود بھی وہ آواز سنی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ نیند کے غلبہ کی وجہ سے وہ اس پر دھیان نہیں دے سکی تھی۔ بہرحال وہ سبطین سے لاکھ درجہ اچھی تھی جو بوجی کی کوکھ سے نکلا تھا اور اس کے باوجود ان کی کسی بات کا یقین نہیں کرتا تھا اور ان کے اشارے کنائے سمجھنے کی تو اس میں سے سے اہلیت ہی نہیں تھی۔ بوجی اپنے آباد گھر میں ایسے منحوس جانور کا نام کیسے لے سکتی تھیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی

تھیں کہ اشاروں کنایوں میں اس کا ذکر کر دیتیں لیکن اگر سبطین کے دماغ میں گوبر بھرا ہو تو اس کا کیا علاج تھا۔ آخر گلشن نے تھوڑی سی ہمت سے کام لیا اور اس کا نام لینے پر آمادہ ہو گئی۔ لیکن ابھی وہ الف اور ل کی آوازیں ہی نکالنے پائی تھی کہ بوجی نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''ارے لچی کمینی ماری تیری زبان کو لقوا مارے چپکی رہ۔ تو بڑی آئی بھرے گھر میں اس کا نام لینے والی۔'' لیکن خیر گلشن کا مقصد تو پورا ہو ہی گیا یہ الگ بات ہے کہ سبطین نے اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے کی بجائے الٹا غریب بوجی کو لتاڑ دیا۔ ''بوجی تم تو بالکل سٹھیا گئی ہو۔ بالکل دقیانوسی باتیں کرتی ہو۔''

بوجی واقعی دقیانوسی باتیں کرتی تھیں مجھے شک آرے ہے کا فقرہ تو گویا ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ہر بات میں شک ہر کام میں شک۔ پتہ کھڑکا اور ان کے کان کھڑے ہوئے الٹی آنکھ مہکی اور ان کا دل دھڑکا۔ ہچکیاں آنی شروع ہوتیں تھیں تو یقین کر لیتی تھیں کہ انہیں کوئی یاد کر رہا ہے۔ اگر کہیں زبان کٹ جاتی تو فوراً گمان گزرتا کہ کوئی ان کی غیبت کر رہا ہے جانور ان کے لیے جانور نہیں بلکہ نیکی اور بدی کے نمائندے تھے۔ کسی سے نیک شگن لیتی تھیں کسی کو بدفال سمجھتی تھیں اور کسی کو نجاست کی پوٹ تصور کرتی تھیں۔ مرغیاں تو خیر انہوں نے انڈوں کے شوق میں پال رکھی تھیں۔ لیکن کبوتر پالنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ گھر میں فرشتوں اور نیک روحوں کی آمد و رفت رہے۔ سبطین نے جب کتا پالنے کی نیت باندھی تھی تو اس کی اجازت انہوں نے صرف اس بنا پر نہیں دی کہ جس گھر میں کتا رہتا ہے وہاں فرشتے قدم نہیں رکھتے۔ اس بات کا وہ خاص طور پر اہتمام رکھتی تھیں کہ جمعرات کی شام کو کالی بلی یا کالے کتے پر ان کی نظر نہ پڑے۔ صبح کے سلسلہ میں یہ اہتمام بندر کے لیے کیا گیا تھا۔ بوجی کا تجربہ یہی بتاتا تھا کہ جب کبھی صبح آنکھ کھلتے ہی بندر نظر آ گیا۔ سارا دن پریشانی میں گزرا۔ سانپ کو زمین کا اور شیر کو جنگل کا بادشاہ سمجھتی تھیں۔ سانپ کے لیے انہوں نے ایک آیت یاد رکھی تھی جس کے اثر سے سانپ اپنی جگہ پر جما کا جما رہ جاتا تھا اور جنگل کے بادشاہ کا علاج تو خیر سلمان فارسی نے بتا ہی رکھا تھا۔ نادعلی اتنی لمبی چوڑی عبارت تو نہ تھی کہ بوجی کو حفظ نہ ہوتی۔ بوجی گرگٹ کو مارنا ثواب سمجھتی تھیں۔ اگرچہ یہ فرض گلشن یا پھر رفیا مردانے سے آ کر انجام دیتا تھا لیکن بوجی یہی سمجھتی تھیں کہ پلی بھر خون ان کا بڑھا ہے اس کے باوجود انہوں نے مرجھا کر منقی کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ آندھی ان کے لیے آندھی نہیں بلکہ ستر بلاؤں کا جلوس ہوتی تھی۔ کالی آندھی چلتی تھی تو سمجھ لیتی تھیں کہ شاہ جنات کی سواری نکل رہی ہے زلزلہ آتا تو سمجھتیں کہ گائے نے سینگ بدلا ہے۔ اس کہ وجہ سے زمین ہل رہی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ زمین ایک گائے کے سینگوں پر ٹکی ہوئی ہے۔ گہن سورج کو لگتا یا چاند کو انہیں صدقہ دینا ضرور تھا۔ صدقے کے علاوہ وہ رفع بلا کی نیت سے دو رکعت نماز بھی بجالاتی تھیں اور گڑگڑا کر دعا مانگتی تھیں کہ ''الٰہی تجھے اپنے حبیب کا واسطہ چاند پہ جو وقت آن پڑا ہے۔ اسے ٹال دے۔'' مختصر یہ کہ بوجی کا

تصور یہ تھا کہ فطرت کے سارے مظاہر نے غریب انسان کے خلاف لام بندی کر رکھی ہے۔ قصبے کے ایک چوتھائی سے زیادہ مکانوں کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہاں پلید روحیں رہتی ہیں۔ نکڑ شاہ کے احاطہ میں تو سب کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہاں پیر جی نکڑ شاہ کا مزار تھا۔ ایک روز جب وہ وہاں چڑھاوا چڑھانے گئی تھیں تو انہوں نے قبر کے تعویذ میں تازہ تازہ چنبیلی کے پھول رکھے ہوئے دیکھے۔ بوجی کو تعجب تو اس پر تھا کہ چنبیلی کا موسم نہیں' یہ پھول کہاں سے آ گئے پھر بقول ان کے ان پھولوں کی خوشبو اتنی تیز تھی کہ ان کا سارا دماغ خوشبو سے پس گیا۔ پھر ایک جمعرات کی شام کو انہوں نے دیکھا کہ ایک سفید نورانی سایہ ہے جو بلند ہوتا جاتا ہے۔ لحد کے قریب پہنچ کر وہ غائب ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی پلید روح نہیں ہو سکتی تھی۔ پلید روحیں اتنی سفید نورانی بھلا کہاں ہوتی ہیں۔ بوجی نے سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو یہ خود پیر جی نکڑ شاہ تھے پاک روحوں سے بھلا کون ڈرتا ہے اس کی وجہ پاس ادب سمجھئے کہ بوجی پھر اس طرف کبھی نہیں گئیں۔ ہاں انہوں نے یہ التزام ضرور برتا کہ ہر جمعرات کی شام کو وہ پانچ پیسے کے پیڑے منگا کر گلشن کے حوالے کرتی تھیں اور گلشن بڑی دیانتداری سے پیڑوں کا دونا نکڑ شاہ کے مزار پر رکھ آتی تھی۔ بوجی خود بھی بڑی دیانت دار اور سمجھ دار تھیں۔ جب لوگوں میں یہ چرچا ہوا کہ نکڑ شاہ کے مزار پر ہر جمعرات کی شام کو تازہ پیڑے رکھے ملتے ہیں تو انہیں بھول کر بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ خود بھی ہر جمعرات کی شام کو پیڑوں کا دونا وہاں بھجواتی ہیں۔ یہ خیال انہیں آ بھی کیسے سکتا تھا' ان پیڑوں کو جنہوں نے چکھا تھا وہ کہتے تھے کہ ان پیڑوں کا مزہ کچھ بہت ہی عجیب سا ہوتا تھا گویا جنت کا کوئی میوہ کھا رہے ہیں۔ اور کچھ نہ سہی پیر جی نکڑ شاہ کے طفیل لوگوں کو جنت کے میووں کے مزے کا تو پتہ چل ہی گیا۔

دراصل بوجی وقت کے بہت بعد پیدا ہوئی تھیں۔ وہ پیدا کسی زمانے میں بھی ہوتیں انہیں مرجانا چاہیے تھا۔ ۲۰ء کے بعد کی حقیقتوں کو انہوں نے کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔ ان کے لیے دنیا کی تاریخ ۵۷ء کے غدر سے شروع ہوتی تھی اور ۱۴ء کی جنگ پر ختم ہو جاتی تھی۔ یوں ان کے ذہن میں ۵۷ء سے پہلے کی تاریخ کا بھی ایک تصور موجود تھا۔ اس میں کچھ پرستان کے قصے شامل تھے' کچھ عالم بالا کی واردات' کچھ عرب کے واقعات۔ اور یہ سب کچھ مل کر تاریخ تو نہیں تاریخ کا ایک ملغوبہ سا بن گیا تھا۔ بہرحال یہ تو ماضی کی تاریخ تھی۔ حاضر ان کے لیے غدر سے شروع ہو کر پہلی جنگ عظیم پر ختم ہو جاتا تھا اور اس سے آگے بس ایک خلا تھا۔ بازار سے دوپٹوں کی ململ غائب ہو جانے اور گیہوں کا توڑا پڑ جانے کی وجہ سے انہیں دوسری جنگ کا تو پتہ چل گیا تھا۔ لیکن انہوں نے اسے ایک بڑے واقعہ کی حیثیت سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ایک خوفناک قحط کا حال بھی اکثر ان کی زبان سے سنا گیا ہے۔ یہ قحط بھی ۵۷ء اور ۱۴ء کے درمیان کسی زمانے میں پڑا تھا۔ بنگال کے قحط کا علم تو انہیں ضرور ہو گیا ہو گا۔ لیکن اگر اس نے ان کے تخیل میں ہنگامہ پیدا نہیں کیا تو یہ

تصور واقعہ کا ہوا نہ کہ بوجی کے تخیل کا۔ بنگال کے سلسلہ میں وہ بس ایک ہی اصطلاح سے وقف تھیں۔ بنگال کا جادو۔ بنگال کے کال' کی اصطلاح نے ان کے تخیل کے لیے مطلق غذا فراہم نہیں کی۔ بوجی کے دماغ میں شاید یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جتنے ہنگامہ خیز واقعے ہونے تھے وہ ۱۴ء سے پہلے ہو چکے۔ اس کے بعد تو زندگی بس گھسٹ گھسٹ کر اپنے دن پورے کر رہی ہے۔ البتہ مستقبل کے متعلق انہیں ضرور دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کوئی ہنگامہ خیز واقعہ نہ ہو جائے۔ شاید اسی لیے وہ اس مطالعہ میں مصروف رہتی تھیں کہیں کوئی ایسی علامت تو ظاہر نہیں ہوئی ہے جو غدر یا جنگ عظیم سے پہلے ظاہر ہوئی تھی۔ جنگ عظیم سے تو نہیں لیکن غدر سے ضرور چند تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ بوجی کے والد واقعی اللہ کے جی تھے اگر انہیں تھوڑی سی بھی عقل ہوتی تو آج ان کی بیٹی کسی ریاست کی رانی ہوتی۔ بوجی نے ہر آنے جانے والے کو یہ بات بتا رکھی تھی کہ غدر کے زمانے میں دلی کے مغل بادشاہ نے ان کے بڑے ابا کی خدمات سے خوش ہو کر انہیں ایک پروانہ لکھ دیا تھا۔ مگر جب دلی میں بھگدڑ مچی تو وہ بھی وہاں سے پیدل چل پڑے۔ پروانہ نیفے میں اڑس کر ایسے بے خبر ہوئے کہ تین دن بعد انہیں پتہ چلا کہ پروانہ کہیں رستے میں گر پڑا ہے۔ بوجی کو یقین تھا کہ اس پروانے میں مغل بادشاہ نے کوئی بڑی سی ریاست بڑے ابا کے نام لکھ دی تھی۔

بڑے ابا تو خیر تھے ہی اللہ کے جی مگر سبطین کے ابا جان بھی کچھ کم نہ تھے وہ خسر سے بھی چار جوتے بڑھے ہوئے نکلے۔ مغل بادشاہ جتنا بڑے ابا پہ مہربان تھا اتنا ہی انگریز ابا جان سے خوش تھا۔ اگر انہیں اولاد کا ذرا بھی خیال ہوتا تو آج الغاروں پیسہ ہوتا سبطین سونے میں تلتا اور بوجی رانی بنی راج کرتیں۔ مگر توبہ کیجئے۔ وہ ایمانداری کی ٹر میں مرے جاتے تھے۔ روپیوں کی بوریاں کی بوریاں لے کر سرحد جاتے تھے اور پٹھانوں میں بانٹتے تھے۔ کبھی ایک پائی کی بے ایمانی نہیں کی۔ انگریز ان کی وفاداری اور ایمانداری سے بہت خوش تھا۔ لیکن تھا نرا خشکا۔ تنخواہ ونخواہ تو بڑھائی نہیں خالی خطاب دے کر ٹرخا دیا۔ سبطین کے ابا جان اسی میں خوش تھے۔ مرے تو سارے خطابات سینے پہ دھر کے لے گئے اور جائداد کے نام بس ایک مکان' آٹھ دس دوکانیں' بیس تیس بیگھ زمین' اور ساٹھ پینسٹھ ہزار کا بینک کا حساب چھوڑا۔ بوجی نے اس پر بھی خدا کر شکر ادا کیا۔ ایک یتیم اور بیوہ کے لیے روکھی سوکھی روٹیوں کا سہارا تو ہو ہی گیا۔

بوجی نے اپنے یتیم بچے سے بڑی امیدیں باندھی تھیں لیکن اس نے بڑے ہو کر وہ گل کھلائے کہ ان کے سارے ارمانوں پہ اوس پڑ گئی۔ بڑے بوڑھے اسی لیے ہوا کرتے ہیں کہ نوجوان انہیں دیکھ کر عبرت پکڑیں۔ باپ دادا کی غلطیوں سے جو شخص سبق نہ سیکھے اس سے زیادہ بے وقوف کون۔ لیکن بوجی سچ کہتی تھیں کہ ''کسی کا ایک بگڑتا ہوگا دو بگڑتے ہوں گے۔ ہمارا آوا کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔'' سبطین نے تو وہ مثل سچ کر دکھائی کہ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ لیکن سبطین کے باپ اور نانا نے دولت نہ کمائی ہو

نام تو ضرور پیدا کیا تھا۔ سرکار دربار میں ان کی وہ پوچھ تھی کہ کیا کسی کی ہوگی۔ اور ابا جان نے تو روپیہ کمانے کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی ورنہ دولت تو ان کی ٹھوکروں سے لگی پڑیں تھی۔ انہیں نام پیدا کرنے کی آرزو تھی سو نام خوب پیدا کیا۔ وائسرائے کے برابر کرسی ملتی تھی۔ خطابات کی ایک پوری قطار نام کے ساتھ ٹنکی ہوئی تھی۔ انگریز نے اتنا بڑا عہدہ پہلی مرتبہ ایک مسلمان کو دیا تھا۔ آج تک لوگ ان کے مرتبہ اور عزت کو یاد کرتے تھے۔ مگر سبطین اس سے بھی گیا۔ کمانے کھٹانے کی تو خیر اس میں اہلیت ہی نہ تھی۔ مگر باپ اور نانا دونوں سے زیادہ تعلیم پائی تھی۔ نام تو ضرور پیدا کر سکتا تھا۔ ڈوب یہ پڑ گئی کہ اس نے اپنے آپ کو بھی بدنام کیا اور خاندان کا نام بھی ڈبویا۔ پوت کے پیر پالنے میں نظر آ جاتے ہیں۔ سبطین نے دراصل کالج میں ہی ہاتھ پیر پھیلانے شروع کر دیئے تھے۔ جب قسمت بگڑنے پہ آتی ہے تو سو طرح کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ کالج میں سبطین کی فیاض خاں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ سبطین کچھ خود بگڑا ہوا تھا۔ کچھ فیاض خاں نے اسے بگاڑا۔ بلکہ بوجی تو سارا الزام فیاض خاں ہی کو دیتی تھیں اور سبطین کو بالکل بے قصور بتاتی تھیں۔ مگر فیاض خاں کے والدین کی روایت یہ تھی کہ فیاض گھر سے اچھا خاصا گیا تھا۔ کالج میں جا کر اسے آوارہ لونڈوں کی صحبت ملی بگڑ گیا۔ بوجی کی بھی زیادتی تھی اور فیاض خاں کے والدین بھی غضب کرتے تھے۔ دراصل کوئی کسی کو نہیں بگاڑتا۔ بگڑنے والے خود بگڑ جاتے ہیں۔ جنہیں بگڑنا ہوتا ہے۔ انہیں بھونرے میں پالیے تو بھی کسی نہ کسی طرح بگڑ ہی جاتے ہیں۔ جن کی سنبھلی ہوئی طبیعت ہوتی ہے وہ آواراؤں اور بدمعاشوں میں رہتے ہیں اور کندن بن کر نکلتے ہیں۔ جیسی روح ویسے فرشتے سبطین جیسا خود تھا ویسا ہی اس نے ساتھی تلاش کیا۔ فیاض خاں کی بھی کالج میں کسی اور سے نہ بنی۔ سبطین سے ہفتے بھر کے اندر وہ یوں گھل مل گیا گویا اس سے دوستی گانٹھنے کے لیے ہی وہ اس کالج میں آیا تھا۔ دونوں کو سلیقہ سے بگڑنا تھا اور اس کے لیے دونوں ایک دوسرے کے محتاج تھے۔

سبطین اور فیاض خاں دونوں نرے جنونی تھے۔ جس بات کی دھت لگتی تھی ایک ہی سی لگتی تھی۔ آوارہ گردی پر آتے تو دن دن بھر اور رات رات بھر گھومتے اور سیر نہ ہوتے ہفتوں۔ مہینوں۔ زمین کا گز بنے رہتے اور ہر اچھی بری جگہ پہنچتے اور شرمناک سے شرمناک اور شریفانہ سے شریفانہ حرکت کرتے۔ جب پڑھنے پر آتے تو ہفتوں ہوسٹل کے کمرے میں بند پڑے رہتے۔ رات رات بھر بجلی جلتی اور کتابوں کی ورق گردانی ہوتی۔ یہ کمرہ کیا تھا۔ کتابوں کا اچھا خاصا گودام تھا۔ چارپائی کا کوئی پایہ اونچا ہو جاتا تو بھی کتاب ہی کام میں لائی جاتی اور بستر پر تکیہ نہ ہوتا تو بھی غریب کتابوں پر ہی آفت ٹوٹتی۔ سبطین اور فیاض خاں کمرے سے اکثر غائب رہتے تھے۔ لیکن کمرے میں تالا پڑا ہوا کبھی نہیں پایا گیا۔ بزعم خود وہ اپنے کالج میں قلندری کی روایت قائم کر رہے تھے۔ کہتے تھے کہ جو چیز ضائع ہونی ہے وہ بہر صورت ضائع ہوگی۔ تالا ڈالنا محض الجھیڑا ہے۔ لیکن ان کے کمرے میں رکھا کیا تھا جو کوئی چوری کرنے آتا۔

حجامت کا ٹوٹا پھوٹا سامان' موٹے چھوٹے کپڑے' ردی کاغذ' کتابوں کا انبار' ان چیزوں کے لیے بھلا کون چوری کی مصیبت مول لیتا۔ سبطین اور فیاض خاں دونوں کی فکری زندگی کا آغاز الحاد اور بڑھی ہوئی حجامتوں سے ہوا تھا۔ جب ان کے گھروں پر یہ خبر پہنچی تو گھر والوں نے سر پیٹ لیا۔ بوجی اس دن کو روتی تھیں۔ جب انہوں نے لونڈے کو کالج بھیجا تھا۔ لیکن کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ اب وہ واپس تو نہیں آ سکتا تھا بوجی بہت روئیں دھوئیں آخر صبر کر کے بیٹھ رہیں۔ پہلے تو انہوں نے بیٹے کے عیب پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ مگر ایسی بات کہیں چھپی رہتی ہے۔ خیالات کا پتہ لگنے میں تو خیر دیر لگتی ہے مگر بڑھی ہوئی حجامت تو دور سے نظر آتی ہے۔ جس نے بھی سبطین کے بال بڑھے ہوئے دیکھے انگلی اٹھائی اور آخر کار یہ بھانڈا پھوٹ ہی گیا کہ سبطین اور سبطین کا دوست دونوں مذہب سے پھر گئے ہیں اور خدا کو نہیں مانتے۔ سبطین اور فیاض پہلے دہریہ کہلائے پھر فلسفی مشہور ہوئے پھر شاعر سمجھے گئے پھر شرابی کہلائے پھر رنڈی باز کا خطاب ملا۔ اور آخر میں تان قومی لیڈری پر ٹوٹی۔ یہ تمام منزلیں انہوں نے بڑی باقاعدگی سے اور بہت سرعت سے طے کی تھیں۔ خدا کے وجود کے مسئلہ کو ایک لایعنی بحث قرار دے کر انہوں نے حیات و کائنات کے مسائل پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یہ میدان ایسا ہے کہ آدمی کا قدم ذرا چوک جائے تو وہ شاعری کی سرحد میں جا پہنچا ہے۔ سبطین اور فیاض خاں اپنی چوک پر مطمئن تھے۔ لیکن تھوڑے ہی دن میں شاعری چھوڑ چھاڑ نثر پہ آ رہے۔ پھر ایکا ایکی انہیں خیال آیا کہ اہل قلم بننا ایسے کون سے کمال کی بات ہے مستانہ جوگی اور مست شباب' رسالوں کے افسانہ نگار بھی اہل قلم کہلاتے ہیں اور اخباروں کے دفتروں میں جو لوگ خبروں کا لنگڑی زبان میں ترجمے کرتے ہیں انہوں نے بھی اپنا نام اہل قلم رکھ چھوڑا ہے۔ قلم کو قلمدان میں رکھ کر انہوں نے تماش بینی کا شیوہ اختیار کیا۔ ہر کوٹھے پر پہنچے اور ہر مجرے میں شریک ہوئے۔ یکا یک ان پر یہ انکشاف ہوا کے عورت بازی خاصا پیش پا افتادہ مشغلہ ہے۔ باوا آدم کے وقتوں سے لوگ اس لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں اور پٹی پٹائی چیز کو پیٹ رہے ہیں۔ وہ پھر کبھی اس بازار میں نہیں دیکھے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے جو مشغلہ اختیار کیا اس کے بارے میں راویوں کے بیانات بہت متضاد ہیں۔ اس لیے مناسب یہ ہوگا کہ ان پر سرے سے کان ہی نہ دھرا جائے۔ البتہ اتنا طے ہے کہ انہیں بہت جلد یہ احساس ہو گیا تھا کہ جس مشغلہ کو انہوں نے نیا اور انوکھا سمجھا تھا وہ بھی بہت پٹا پٹایا رستہ ہے۔ اس مشغلہ سے کھٹا کھایا تو وہ پھر کتابوں پہ جھک گئے اور اس مرتبہ ان پر یکا یک قومی اصلاح کا بھوت سوار ہوا۔ یہ وہ موڑ تھا جہاں سے ان کے رستے قدرے الگ الگ ہوئے ورنہ اب تک تو وہ قدم سے قدم ملائے اس طرح چل رہے تھے کہ ان کی چالوں میں فرق کرنا مشکل کیا ناممکن تھا۔ دونوں عالم فاضل دونوں جنونی۔ لیکن اب دونوں کی حیثیتوں کا فرق واضح ہونے لگا۔ سبطین تو خرد کی گھتیاں سلجھاتا رہ گیا۔ لیکن فیاض خاں نے ترقی کر کے ایک مجذوب کی حیثیت اختیار کر لی۔ تھوڑے دن تک اس نے

بھی سبطین کے ساتھ ساتھ قوم کے زوال کے اسباب پر غور کیا تھا۔لیکن بہت جلد وہ مردمجاہد بن کر میدان عمل میں اتر آیا۔یوں عمل کے میدان میں سبطین بھی بعد کو آ گیا۔لیکن اس کی حیثیت پھر بھی ایک مفکر ہی کی رہی۔مردمجاہد وہ کبھی نہ بن سکا۔

سبطین، سبطین سے ڈاکٹر سبطین ہوا اور ہوتے ہوتے پروفیسر ڈاکٹر سبطین بن گیا۔کالج کے لڑکوں کی طرف سے قبول عام کی سند عطا ہوئی۔دوسرے پروفیسر خوب بن ٹھن کر رہتے تھے طرح طرح سے اپنی قابلیت کا سکہ جماتے تھے۔پھر بھی لڑکے ان میں کیڑے ڈالتے تھے اور نہیں تو ٹائی کی گرہ پر ہی نکتہ چینی شروع ہو جاتی تھی۔لیکن پروفیسر ڈاکٹر سبطین کا سب سے بڑا وصف یہی سمجھا گیا کہ وہ بال بکھیرے خاکی کرتا پائجامہ کالج چلے آتے ہیں اور یہی وصف ان کی قابلیت اور علمیت کی دلیل بن گیا۔رفتہ رفتہ انہوں نے طلبہ میں ایک ہیرو بلکہ دیومالا کی ایک شخصیت کی حیثیت اختیار کر لی۔فلسفیوں، شاعروں اور مجذوبوں کے جذب وشوق اور قلندری کی ساری روایات ان سے وابستہ کر دی گئیں۔اگر طلبہ قابل اعتبار راوی ہو سکتے ہیں تو پھر کئی ایک لڑکیاں بھی ان پر جان دینے لگی تھیں۔لیکن انہوں نے اپنی مقبولیت سے فائدہ اٹھانا نہ جانا اور پروفیسر چھوڑ چھاڑ گھر بیٹھ رہے اور قومی اصلاح کی غرض سے ایک اخبار نکالنے کی ٹھانی۔رفتہ رفتہ پروفیسر ڈاکٹر سبطین خالی ڈاکٹر سبطین رہ گئے اور پروفیسر کے لفظ کے ساتھ جمع کا صیغہ بھی غائب ہوا (رفیا کے لیے وہ پہلے بھی سپومیاں تھے۔اب بھی سپومیاں رہا۔)

سبطین نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور بڑے دھڑلے سے ایک انگریزی اخبار نکالا۔فیاض خاں کو ایک خط لکھا گیا کہ قوم کو عمل کی کوئی راہ دکھاؤ اور اخبار کے ذریعہ تعلیم یافتہ طبقہ تک اپنی آواز پہنچاؤ۔فیاض خاں نے شروع شروع میں تو کوئی جواب نہ دیا لیکن جب اس مضمون کے بہت سے خط جمع ہو گئے تو اس نے خط میں سارا قصہ مختصر کر کے یہ شعر لکھ بھیجا۔

مرے لیے ہے فقط زور حیدری کافی
نصیب تجھ کو فلاطوں کی تیزی ادراک

لیکن ڈاکٹر سبطین کی تیزی ادراک خاک کام نہ آئی اور اخبار بالآخر بند کرنا پڑا۔سبطین اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسلمانوں کے متوسط طبقہ کو گھن لگ چکا ہے۔البتہ مسلمان عوام میں ابھی جان باقی ہے اور اگر اسلامی انقلاب کی توقع کی جا سکتی ہے تو انہی عوام سے کی جا سکتی ہے۔ان عوام تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے ایک اردو اخبار کی ضرورت پیش آئی۔چنانچہ اسلامی عوامی انقلاب کی تحریک کی بنا ڈالی گئی اور بڑے ٹھسے سے اخبار ''انقلاب'' جاری کیا گیا فیاض خاں کو مضمون کے لیے پھر زور شور سے خط لکھے گئے۔اور فیاض خاں نے پھر وہی دوٹوک جواب دیا کہ قوم کو فکر کی نہیں بلکہ عمل کی ضرورت ہے قوم کو فکر کی واقعی ضرورت نہیں تھی۔اسلامی عوامی انقلاب کے مجوزہ

نقیب متوسط طبقہ سے بھی بازی لے گئے۔ چنانچہ ''انقلاب'' کو اتنی عمر بھی نصیب نہ ہوئی جتنی انگریزی اخبار کو نصیب ہوئی تھی۔ آخر پرچے کا ایڈیٹوریل سبطین نے بڑے خضوع وخشوع سے لکھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے' ہاتھ کانپ رہا تھا اور قلم چل رہا تھا۔ اڈیٹوریل کے دوران میں تو نہیں لیکن اسے پورا کر چکنے کے بعد ضرور سبطین کو یہ خیال آیا کے یہ ایڈیٹوریل مولانا محمد علی کا ایڈیٹوریل ثابت ہوگا اور ''انقلاب'' کے دفتر میں چندہ یوں برسے گا جیسے کبھی ''ہمدرد'' کے دفتر میں اس کی بارش ہوئی تھی۔ بارش کا انتظار کیا گیا لیکن بارش نہیں ہوئی۔ دفتر میں چندے کا کوئی منی آرڈر موصول نہ ہوا۔ البتہ وی' پی کے چند پرچے ضرور واپس آئے۔ اور سبطین نے اس سوچ میں ایک وقت کا کھانا نہیں کھایا کہ آخر مولانا محمد علی کے زمانے کے مسلمان کیا ہوئے۔ اس پرچے میں قوم کی بے حسی کا ماتم کرتے ہوئے اعلان تو یہی کیا گیا تھا۔ کہ یہ آخری پرچہ ہے۔ لیکن واقعہ یوں ہے کہ اس کے بعد دو اشاعتیں اور بھی نکلیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ گن نہیں بلکہ تل کر بکیں۔

فیاض خاں کا طور کچھ اور تھا۔ باپ کی مار اباندھی سے وہ آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھ گیا تھا اور پاس بھی کر لیا تھا وہ یوں بھی مطمئن تھا۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ کلکٹری کی تقریب سے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے مواقع زیادہ میسر ہوں گے۔ پہلے اس کا تقرر لکھنو میں ہوا تھا۔ لیکن اس نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا۔ دفتری خط وکتابت میں اس نے کچھ ہی عذر پیش کیا ہو گھر بیٹھ کر اس نے یہی کہا کہ لکھنو جا کے کیا کروں گا۔ جس شہر کے نوجوان مثنوی زہر عشق پڑھ پڑھ کر زہر کھالیں اور سستے تھیٹر دیکھنے میں مشکیں بیچ ڈالیں' اس شہر کے لوگوں سے کسی انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس نے کہہ سن کر اپنا تقرر کلکتہ میں کر لیا۔ بنگالی مسلمانوں سے اسے بڑی توقعات تھیں لیکن پتہ یہ چلا کہ بنگالی کے مسلمان دہشت پسند مولانا محمد علی کے زمانے کے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ رخصت ہو گئے۔ فیاض خاں نے کلکتہ سے اپنا تبادلہ جنوبی ہند میں کرایا۔ سواحل مدراس کے جنوب کے علاقے میں موپلوں کا ایک بڑا جتھا آباد تھا۔ فیاض خاں کو ان مسلمانوں میں بڑی جان نظر آئی۔ اس نے پورے زور شور سے تنظیم کا کام شروع کر دیا۔ لیکن موپلوں میں جتنی جان تھی اس میں تولہ ماشہ کیا رتی بھر کا بھی اضافہ نہ ہوا البتہ اس کی کلکٹری کی جان پہ بن آئی۔ فیاض خاں نے دن سے استعفا داغ دیا اور جنوبی ہند سے بگٹٹ لاہور پہنچا۔ پنجاب سے اسے بڑی امیدیں تھیں۔ آخر سرسید نے بھی تو اسی صوبے سے ساری توقعات وابستہ کی تھیں۔ اس نے راستے میں یہ بھی طے کر لیا تھا کہ زندہ دل' کا خطاب تو اب خاصا بوسیدہ ہو چکا ہے۔ اب پنجاب والوں کو کسی اور خطاب سے نوازنا چاہیے۔ لاہور پہنچ کر اپنے زمانے کے اس سرسید نے ایک سڑے بے کالج میں پروفیسری کر لی۔ لیکن اصل مقصد تو کچھ اور ہی تھی۔ یہ تو ملاقات کی تقریب نکالی گئی تھی۔ مسلمانوں کی جس بستی

میں بھی جایئے اس میں ایک ڈیڑھ مجذوب کسی کونے کھدرے میں پڑا پڑا یا مل ہی جاتا ہے۔ یہاں فیاض خاں کی مڈبھیڑ مزمل سے ہو گئی۔ مزمل میں پیغمبر بننے کی تو نہیں لیکن پیغمبر کی ناک کا بال بننے کی ساری صلاحتیں موجود تھیں۔ مزمل اپنی صلاحیت کی بنا پر فیاض خاں کا مرید ہوا تھا۔ فیاض خاں کا اس میں کچھ کمال نہ تھا۔ فیاض خاں نے لاہور کی ایک ایک گلی اور ایک ایک کوچہ چھان مارا مگر دوسرا مرید اسے نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ آخر لاہور کے بارے میں اسے اپنی رائے بدلنی ہی پڑی۔ اسی زمانے میں اس کے والد ملازمت سے پنشن پاکر اپنے وطن پشاور پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اسے بلاوا بھیجا۔ لیکن اس نے انہیں ٹکا سا جواب لکھ دیا کہ پٹھان قوم جاہل۔ میری بات نہیں سمجھے گی۔ میں وہاں آ کر کیا کروں گا اس کے بعد اس نے مزمل کو اپنا فلسفہ بنا کر لاہور میں چھوڑا اور بستر بوریا باندھ سرسید کے محبوب صوبے سے سرسید کے محبوب شہر کا رخ کیا۔ وہاں جا کر اس نے رسل گنج میں تالوں کی دوکان کھول لی۔ لیکن علی گڑھ نے لاہور کے بھی چونا لگایا۔ یہ تو سرسید جانیں کہ وہ مسلمان قوم کو کیا بنانا چاہتے تھے۔ صاحب جنوں یا اہل خرد۔ مگر واقعہ یوں ہے کہ علی گڑھ والے چلتا پرزہ بن گئے تھے۔ انہوں نے فیاض خاں کو پٹھے پہ ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیا۔ ذوق جنوں کا ٹوٹا تو لاہور میں بھی تھا لیکن وہاں بانگی تو ایک مل ہی گیا تھا۔ یہاں بانگی بھی میسر نہ آئی۔ البتہ علی گڑھ والوں نے فیاض خاں کے تالوں کی خوب قدر کی۔ یہ بھی عجب لطف رہا کہ ہر جگہ فیاض خاں کا ثانوی کاروبار چلا اور اصل مال کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں کی۔ حسن پور والوں نے اس کی تعریفوں کے پل باندھے اور کہا کہ پٹھان ہو کے ایسی شستہ اور رواں اردو بولتا ہے۔ انہوں نے اس کی تقریروں پر واہ واہ کی لیکن تقریروں کے موضوع کو گول کر گئے۔ کلکتہ میں کلکٹری خوب چمکی لیکن لیڈری کا رنگ پھیکا رہا۔ موپلوں نے اس کے اخلاق اور شرافت کے گن گائے لیکن اس کی تنظیمی صلاحیتوں کا لوہا ماننے سے انکار کر دیا۔ لاہور میں پروفیسری خوب چلی مگر تبلیغ کی دال نہ گلی۔ علی گڑھ والوں نے تالے ہاتھوں سے خریدے لیکن اسلامی عوامی انقلاب کے مال کو ہاتھ نہ لگایا۔ غرض فیاض خاں کی اردو دانی سے لے کر قفل سازی تک ہر چیز چل گئی نہ چلی تو اصلاح اور انقلابی تحریک نہ چلی۔

مدرسہ اسلامیہ سے جب نوکری کا پروانہ آیا تو فیاض خاں نے رسل گنج کی تالوں کی دوکان میں اسی شان سے تالا ڈالا جس شان سے کلکٹری کو لات مار کر استعفا دا غا تھا۔ یہ سچ ہے کہ سرسید کے اصل وطن کو آزمالینے میں مضائقہ بھی کیا تھا۔

فیاض خاں کے سر میں ایک سودا سمایا ہوا تھا۔ اس کی خاطر وہ بستی بستی گھوما اور شہر شہر کی خاک چھانی۔ حسن پور سے کلکتہ' کلکتہ سے جنوبی ہند' جنوبی ہند سے لاہور' لاہور سے علی گڑھ' علی گڑھ سے دلی' فیاض خاں تو واقعی اپنے زمانے کا سید احمد خاں بننے پر تلا ہوا تھا۔

رفیا نے بڑے طمطراق سے اعلان کیا کہ ''لو میاں دس سالے انگریز کا ٹنڈیرا بندھ گیا۔''

کالے خاں ہکا بکا رہ گیا۔ علن پنواڑی بھی ایک مرتبہ تو چونک ہی پڑا لیکن اس میں بے سوچے سمجھے ایمان لانے کی صلاحیت کم تھی اور پھر یوں بھی انگریزوں سے اسے ہمیشہ سے انس تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور رفیا کے اعلان کا بڑے کلمیت آمیز انداز میں استقبال کیا۔ ''چنڈوخانے سے سن کے آیا ہوگا بے۔''

''چنڈوخانہ تیری جاداد ہے۔ میں اسے ہاتھ نئیں لگاؤں گا۔''

''تو پھر کسی چڑی مار سے سن کے آیا ہوگا۔'' علن نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

تھوڑی بہت زمین تو ضرور تیار ہوگئی تھی لیکن رفیا ابھی اپنا آزمودہ داؤں مارنے سے گریز کر رہا تھا۔ چڑی مار کا لفظ سن کے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آخر اس نے اپنا داؤں مار ہی دیا۔ ''مرغی کے اخبار کو چڑی مار بتاوے ہے۔ سالے سپو میاں نے خود اخبار سے پڑھ کر مجھے خبر سنائی ہے۔''

اخبار اور پھر سپو میاں۔ علن غریب بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ دوہری مار سے تو اچھے اچھے نہیں پنپتے۔ کالے خاں تو پہلے ہی وار میں کشتہ ہو چکا تھا۔ البتہ علن کے اعتراضات سے اس کے ایمان میں خلل پڑنے کا اندیشہ پیدا ہو چلا تھا۔ لیکن اخبار اور سپو میاں کا نام سن کر اس کا تذبذب پھر یقین سے بدل گیا۔

سبطین کی ذات سے کسی اور کو فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو لیکن رفیا کو اس سے فائدہ بہت پہنچا تھا بوجی تو بیٹے کے متعلق ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ ''بلی کا گو ہے لیپنا نہ پوتنا۔'' لیکن اسے مبالغہ آرائی سمجھنا چاہیے۔ خدا تعالےٰ نے ایسی چیز کوئی پیدا نہیں کی ہے جس کا کوئی مصرف نہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ سبطین کی علمیت اور سیاسی سوجھ بوجھ اسلامی عوامی انقلابی تحریک کے کام نہ آئی لیکن اس کے بل پر رفیا نے تو اپنی سیاسی بصیرت کے جھنڈے گاڑ ہی دیئے علن کی دوکان پر رفیا کے کسی بیان میں جب کبھی بھی کسی رشتہ کا اظہار کیا گیا اس نے وہی اپنا آزمودہ نسخہ استعمال کیا کہ ''سپو میاں یوں کہہ رہے تھے۔'' اور اس فقرے کے ساتھ ساتھ سارے اختلافات اور سارے شبہات ختم ہو جاتے تھے دینوی معاملات میں تو لوگ سبطین کو بوجی کی تقلید میں واقعی بلی کا گو سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے علم و فضل اور اس کی سیاسی باریک بینی کا لوہا فضل حق وکیل سے لے کر علن پنواڑی تک سب ہی مانتے تھے۔ لہٰذا جب کبھی کسی عالمانہ بحث میں رفیا نے اپنے سپو میاں کا حوالہ دیا۔ معترضین کی زبان بند ہو جاتی تھی۔ گویا علن کی دوکان پر بیٹھنے والوں نے سبطین کو اچھی خاصی صحیح بخاری' سمجھ رکھا تھا لیکن صحیح بخاری کے متعلق رفتہ رفتہ محققین نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ اس میں یاروں نے بہت سے غلط حدیثیں بھی شامل کر دی ہیں۔ رفیا کے حوالہ کی صحت کا ایک دو مرتبہ نہیں متعدد مرتبہ سوال اٹھا تھا۔ رفیا نے بھی غضب کیا تھا۔ جا بے جا وقت بے وقت سپو

میاں کے وہ اتنے حوالے دیتا تھا کہ لوگوں کو شبہ ہونے لگا تھا کہ سپو میاں رفیا سے کچھ بات بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ لیکن رفیا بڑے دعوے بلکہ رعونت سے کہتا تھا کہ ''اجی مجال ہے سپو میاں کی کہ میں ون سے پوچھوں اور وے جواب نہ دیں۔'' 'دروغ بر گردن راوی' رفیا کی باتوں سے یہی پتا چلتا تھا کہ گھر میں رفیا کی بات چلتی ہے۔ اور سپو میاں تو فالتو کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ وہ بوجی کے پیٹ سے ضرور پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن وہ آنکھوں کا تارا رفیا کو سمجھتی ہیں اور یہ کہ سپو میاں کو سوائے رفیا سے باتیں کرنے اور اس کے سوالوں کے جواب دینے کے اور کوئی کام نہیں ہے۔ علن تو تھا ہی شکی۔ اور رفیا کا عروج یوں بھی اسے گوارا نہ تھا۔ ایک روز اس نے بھن کر کہہ ہی دیا کہ ''پیارے تجھے بچارے سپو میاں مل گئے ہیں۔ سیدھے سادے بھولے بھالے۔ دن پہ دھونس جما لیتا ہے۔ ہوتے اگر ڈپٹی صاحب زندہ تو بچو چھکڑی بھول جاتا۔''

رفیا بہت پھنپھنایا۔ تاؤ میں آ کر بولا۔ ''بھتنی کے ڈپٹی صاحب کا زمانہ بھی دیکھا ہے میاں دے تو میری ایسی خاطر کریوں تھے کہ کیا کوئی کرے گا۔ ایک دفعے سپو میاں نے کڑوی بات کہہ دی تھی۔ اکڑ گیا۔ ون سے ڈپٹی صاب کو خط ڈال دیا کہ میں دلی آ رہا ہوں جی۔ سپو میاں سے میری نئیں پٹتی۔ بس جی چل کھڑا ہوا۔''

''اور سپو میاں نے تجھے جانے دیا؟'' علن تو قدم قدم پر شک کا اظہار کر رہا تھا۔

رفیا طنز آمیز انداز میں ہنسا۔ ''سپو میاں کے فرشتے خاں کو بھی پتہ نئیں چلا۔ بوجی کو میں نے یہ ٹاما دیا کہ جی سینما دیکھنے جاریا اوں۔ بس جی میں جو دلی پہنچا تو موٹروں کی ایک لین لگی ہوئی تھی۔ ڈپٹی صاب تھے بڑے رعاب شعاب کے آدمی۔ میرا خط پہنچا تو ویسرائے کو کہلا بھیجا کہ ہمارے منشی جی آ رہے ہیں۔ سواری بھیج دو۔''

''منشی جی'' علن بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ کالے خاں کی بھی ہنسی چھوٹ پڑی۔

یہ وقعی رفیا کا کمزور پہلو تھا۔ وہ جھینپ گیا اور محض اس جھینپ کو مٹانے کی خاطر اس نے زیادہ زور شور سے اپنا قصہ سنانا شروع کر دیا۔ ''تو بھیا جب میں موٹر میں بیٹھ کے چلا ہوں تو بس یہ سمجھ لو کہ بزار والے گھور گھور کے دکھیں تھے اور سلام کریں تھے۔''

''سوچتے ہوں گے کہ دلی میں نیا جناور کونسا آ گیا۔

رفیا علن کے اس فقرے کو صاف پی گیا اور پھر شروع ہو گیا۔ ''پیارے دلی میں بڑی سیریں کیں۔ رائے سینا کے بر بر جمعہ محبت لگی ہوئی تھی۔ روز زینہ واں پہ جاتا تھا اور قطب صاب کی لاٹھ پہ چڑھتا تھا۔''

کالے خاں کی آنکھیں تارا بن گئیں۔ ''قطب صاب کی لاٹھ یہ چڑھتا تھا؟''

''ہاں بے اور کیا میں جمعہ محبت انڈے دینے جاتا تھا۔'' رفیا کو کالے خاں کی جہالت پہ اکثر غصہ آ جاتا تھا۔

''سالے پھر تو دلی چھوڑ کے یاں کیوں ایسی کی تیسی کرانے آ گیا؟''

علن کا سوال واقعی ٹیڑھا تھا۔ لیکن اسے جواب بھی دندان شکن ملا۔ یاں تیری ایسی کی تیسی کون کرتا۔'' پھر رفیا لہجہ بدلتے ہوئے بڑے سنجیدگی سے بولا۔ ''اماں بات یہ تھی کہ ڈپٹی صاب خود مجھے پہنچانے آئے۔ میں نے کہا کہ یار رفیا جانے بھی دے۔ سپو میاں کو ہی بڑا بن جانے دے مگر فر سپو میاں نے مجھ سے معافی مانگ لی۔''

کمبخت علن پھر ہنس پڑا۔

علن کی ہنسی نے کام خراب کر دیا۔ کالے خاں پر بھی وہ اثر نہیں ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔

رفیا جھلا پڑا۔ ''سالے مرغی والے میرا یقین نئیں آتا مت کر تیری اماں گلشن جو ہے وس سے جا کے پوچھ لے۔''

کالے خاں نے تو فوراً یقین کر لیا۔ علن کہاں تک مقابلہ کرتا۔ آخر اس نے بھی ہتھیار پھینک دیئے۔ کالے خاں نے کبھی اس غریب کا آخر وقت تک ساتھ ہی نہیں دیا۔ جہاں ذرا رفیا کی آواز میں گرمی آئی اس کی تشکیک کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ وہ خود بھی سچ بولتا ہے اور باقی سب لوگ بھی سچ بولتے ہیں۔ جھوٹوں کو ساری دنیا جھوٹی دکھائی دیتی ہے۔ لوگوں کو اس کی پٹھانی تک میں شبہ ہوا تھا۔ لیکن کسی کی ایک نہ چلی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک مرتبہ اپنی پٹھانی پر ایمان لے آنے کے بعد اسے پھر کبھی اس میں شبہ نہیں ہوا۔ پھر دوسرے کیا کر لیتے۔ دراصل سچ اور جھوٹ کا تعلق خارجی دنیا سے تو ہے نہیں۔ یہ تو دو الگ الگ ذہنی کیفیتیں ہیں۔ جو بات دیانتداری سے محسوس کی گئی ہے اور مدعی کی شخصیت کا جز بن گئی ہے۔ وہ سچ ہے۔ یہ سوال اٹھانا کہ اس بات نے خارجی دنیا میں ظہور کیا ہے یا نہیں۔ سچ کے تصور کو مسخ کرنا ہے اگر کہنے والے کی نیت میں فتور ہے اور اس کا دعویٰ اس کی شخصیت کا جز نہیں بن سکا ہے تو اس کا خارجی دنیا میں لاکھ وجود ہو۔ وہ کھلا ہوا جھوٹ ہی رہے گا۔ ممکن ہے کالے خاں دون کی لیتا ہو مگر بولتا تھا وہ سچ۔ آخر اتنے سید کہاں سے آ گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ خاندان میں سے سمجھنے لگتا ہے۔ کالے خاں کے لیے پٹھانی دین ایمان کا معاملہ تھی وہ اس کے خوں میں رچی ہوئی ہو یا نہ ہو اس کی ذہنیت میں ضرور بس گئی تھی۔ پٹھانی اس کی شخصیت ہی کا نہیں اس کے نام کا بھی جزو بن چکی تھی۔ اب یہ کون کہہ سکتا تھا کہ کالے خاں ایک زمانے میں کالے خاں نہیں بلکہ کلو تھا۔ اس زمانے میں اگر کوئی ٹھکانے کا ماہر لسانیات ہوتا تو کالے خاں کے نام پہ تحقیق کرنے بیٹھ جاتا اور لفظوں کی شکلیں بدلنے کے متعلق ایک اچھا خاصا نظریہ وضع کر

لیتا۔ خیر ہے تو یہ لسانیات کا موضوع مگر اشارتاً اتنا بتا دینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے کہ کالے خاں اصل میں کالے خاں نہیں تھا اس کا اصل نام کیا تھا۔ یہ تو شاید کوئی بھی نہ بتا سکے۔ اس کے ماں باپ ضرور بتا سکتے تھے مگر اس کے ماں باپ تھے کہا۔ وہ تو ان شخصیتوں میں سے تھا جن کا کوئی آگا پیچھا نہیں ہوتا۔ لیکن جو محلوں کی زندگی لازمی جز ہوتے ہیں۔ وہ اسی شہر کا رہنے والا تھا یا کہیں باہر سے آیا تھا' کہاں سے آیا تھا' کون تھا' آسمان نے اگلا تھا یا زمین سے اگا تھا۔ اس کے متعلق کسی کو کچھ پتہ نہیں۔ شاید اسی لیے اسے پٹھان بننے میں کسی خاص دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ چونکہ وہ کالا بھجنگ تھا اس لیے محلہ والوں نے اسے کلو کہنا شروع کر دیا۔ کلو سے وہ کلوا بنا اور پھر کالے کہلانے لگا۔ ابھی وہ کالے ہی بنا تھا کہ لڑائی شروع ہوگئی۔ سپاہیوں کی بھرتی شروع ہوئی تو اس کا نمبر بھی آ گیا۔ پیدل فوج میں بھرتی ہو کر محاذ پہ لد گیا۔ مگر بڑا سخت جان نکلا بچ کر صحیح سلامت آ گیا۔ لڑائی سے واپسی پر وہ دو تمغے اپنے ساتھ لایا۔ مونچھیں اور پٹھانی۔ شروع شروع میں اس نے اپنی زبان میں بھی پٹھانیت پیدا کرنے کی جان توڑ کوشش کی تھی۔ اپنے لیے وہ جمع متکلم کا صیغہ استعمال کرتا تھا اور ھ کی آواز کو بڑے سلیقے سے کچل کر ''ہم'' کو ''ام'' کہتا تھا۔ لیکن اس کوشش میں اس نے منہ کی کھائی۔ رفتہ رفتہ وہ پھر اپنی سیدھی سادی زبان بولنے لگا۔ دراصل محاذ پر اسے پٹھان رجمنٹ کے ساتھ رہنا پڑا تھا اور واں پٹھانوں سے وہ ایک نیا جذبہ لے کر گھر پہنچا تھا۔ یوں کالے' کالے خاں بن گیا۔ کالا بھجنگ۔ لمبا تڑنگا۔ بھرے بھرے ڈنڑ۔ یہ لمبی لمبی کالی مونچھیں۔ برمیں خاکی کرتا۔ ہاتھ میں بلم لگی ہوئی لاٹھی۔ کالے واقعی کالے خاں لگتا تھا۔ جس کسی نے اس کی پٹھانی میں شک کی نیت باندھی کالے خاں لڑنے مرنے پہ تل گیا۔ لٹھ پونگے سے دنیا ڈرتی ہے اور اس کی تو یوں بھی شہر بھر میں دھاک تھی۔ کسی کے سر میں پھوڑا نکلا تھا جو اس سے لڑائی باندھتا کالے خاں کا رنگ تو یہی بتاتا تھا کہ وہ مٹی کا بنا ہوا ہے اور مٹی بھی دکن والی کالی مٹی۔ لیکن مزاج کے اعتبار سے تو وہ نرا آگ تھا۔ بس یوں سمجھو کہ انگارہ خاکی تھا۔ ذرا سی بات پہ فوں خاں ہو جاتا تھا پھر وہ لڑائی ٹھنتی تھی کہ خدا کی پناہ۔ پورے پورے خاندان لاٹھیاں لے کر نکل آتے تھے اور اس کی لاٹھی کالو ہامان کر واپس جاتے تھے۔ شہر کا کونسا تیس مار خاں تھا جس کو اس کی لاٹھی کا تجربہ نہ تھا۔ سنتے ہیں کہ کالے جب لڑائی پر چلا گیا تھا تو چند سر پھرے تیس مار خانوں نے بہت سر اٹھایا تھا۔ ہر بات میں رفیا اور علن کے منہ آتے تھے لیکن جب کالے پلٹا اور اپنی کالے خانی کا اعلان کیا تو یہ سارے تیس مار خاں جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ رفیا اور علن یوں کالے خاں پر فقرہ بازی بھی کر لیتے تھے اور اس سے ہر طرح سے کمزور ہونے کے باوجود اس پر دھونس بھی جما لیتے تھے لیکن آڑے وقت میں ہمیشہ اس کے ساتھ لاٹھیاں تانے ہوئے دیکھے گئے۔ بلکہ وہ تو دراصل پیراں نمی پرند مریداں نمی پرانند' والا مضمون کرتے تھے۔ کالے خاں جو کچھ تھا وہ تو تھا ہی۔ اس کی شخصیت کے گرد ہالہ بننے کا کام زیادہ تر رفیا نے اور تھوڑا بہت علن نے انجام دیا تھا۔ اس کی کالے

خانی کا چرچا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔علن نے حسب عادت شروع میں اس کی پٹھانی میں شبہ ضرور ظاہر کیا تھا۔لیکن کالے خاں نے ایسے وثوق سے پشاور کا ذکر کیا کہ اسے آخر یقین کرنا ہی پڑا۔کالے خاں نے اسے یقین دلانیکے لیے یہاں تک کہا تھا کہ فیاض خاں اسی محلہ کا رہنے والا ہے جس کا وہ رہنے والا تھا۔وہ روز اسے کالج جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا(فیاض خاں کی روایت یہ تھی کہ والد کے ساتھ ساتھ وہ سلسلہ تعلیم شروع ہونے سے پہلے ہی پشاور سے چلا آیا تھا)

کالے خاں کو شہرت علن کی دوکان سے حاصل ہوئی۔علن کی دوکان کی ساکھ کالے خاں کی وجہ سے قائم ہوئی۔اگر کالے خاں اس دوکان پر آ کر نہ بیٹھا کرتا تو اس کی حیثیت ہی کیا ہوتی۔اور اگر کالے خاں وہاں آ کر نہ بیٹھا کرتا تو پھر کہاں جا کر بیٹھا کرتا۔اصل بات یوں تھی کہ اس پورے کارواں میں مرکزی حیثیت نہ تو کالے خاں کو حاصل تھی اور نہ رفیا کو اور نہ علن کو۔یہ حیثیت تو دوکان کو حاصل تھی۔علن یوں تو پنواڑی ہی کی صف میں گنا جاتا تھا لیکن اگر کوئی یہ چیلنج کر بیٹھتا کہ علن کی دوکان پنواڑی کی دوکان نہیں ہے تو اسے جھٹلانا واقعی بہت مشکل ہو جاتا۔اس دوکان پر پان ضرور بکتے تھے لیکن شیشے کے ان میلے مرتبانوں کو بھی تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔جن میں سے کسی میں کشمش کسی میں چھوارے' کسی میں چنے کسی میں سوکھی سڑی گڑ دھانیاں اور نہ جانے کس میں کیا کیا بھرا رکھا تھا۔دراصل ان میں سے زیادہ تر چیزیں روکن کے سلسلہ میں صرف ہوتی تھیں یا پھر رفیا اور کالے خاں دو دو چار چار دانے نکال کر ٹونگتے رہتے تھے۔لیکن ایسے ناعاقبت اندیش بچے بھی تھے جو وقتی گڑ دھانیاں خرید کر لے جاتے تھے۔گڑ دھانیوں میں تو خیر مکھیوں کے فضلے کے سوا اور کوئی خاص عیب نہ ہوتا تھا لیکن ریوڑیوں سے تو بری طرح تمباکو کی بو آتی تھی۔پھر بھی بعض کاہل اور سست بچے فقیرا حلوائی کی دوکان تک جانے سے گھبراتے اور علن سے ریوڑیاں خرید کر لے جاتے جو نام کو ریوڑیاں اور اصل میں تمباکو کو ملا گڑ ہوتا تھا۔باوا آدم کے کی پرانی وہرانی ہنڈیوں اور مٹکیوں میں جو دالیں بھری رکھی تھیں۔وہ خوب بکتی تھیں۔گاہکوں کو یہ شکایت تو ضرور تھی۔کہ علن کی دالوں میں مٹی ملی ہوئی ہوتی ہے۔لیکن معاشی مقاطعہ کا خیال وہ کبھی دل میں نہیں لائے۔البتہ چلموں میں جو الماری کے خانوں اور طاقوں میں چنی رکھی تھیں اس کے سوا اور کوئی عیب نہیں پایا گیا کہ گرد زیادہ جم جانے کی وجہ سے ان کی چمک دمک مدھم پڑ گئی تھی۔پتنگوں کے سلسلہ میں سرے سے اس قسم کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔پتنگ اڑانے والے بالعموم صرف پتنگ سے غرض رکھتے ہیں اور نئی پرانی کا سوال نہیں اٹھاتے۔علن کی دوکان میں ایسی چیزیں بھی خاصی تعداد میں تھیں جن کا تعلق خرید و فروخت سے نہیں بلکہ آرائش سے تھا۔وہ ان گنت بوتلیں جن میں رنگ برنگا پانی بھرا رکھا تھا اور جن پہ گرد کا خاصا دبیز غلاف چڑھ چکا تھا۔ظاہر ہے کہ زیبائش کی غرض سے چنی گئی تھیں۔نرگس اور ثریا کی تصویروں کے علاوہ اس تصویر کا مقصد بھی سوائے آرائش کے اور کچھ نہ تھا

جس میں ایک برہنہ عورت ململ کی ایک دھجی بدن پر لپیٹے مور کو دانہ ڈال رہی تھی۔ رہا مولانا محمد علی مصطفٰے کمال' علامہ اقبال اور قائداعظم کی تصویروں کا سوال تو ان کی حیثیت بیک وقت افادی بھی تھی اور جمالیاتی بھی البتہ گاما' بھولا اور گونگے کی تصویریں خالی خولی جلال کی مظہر تھیں۔

اس دوکان می گنانے کی اور چیزیں بھی تھیں۔ لیکن گنتی گنانے سے فائدہ۔ علن تو پانوں سے لے کر گڑ دھانیوں تک ہر سودے کی چیز کو ثانوی حیثیت دیتا تھا۔ اس دوکان کا اصل مال تو کالے خاں اور رفیا تھے۔ مگر وقت یہ تھی کہ یہ بکاؤ چیزیں نہیں تھیں۔ بس آؤ دیکھ جاؤ جس کسی نے بھی یہاں کھڑے ہو کر رفیا سے دلی کا حال اور کالے خاں سے پشاور کی خوبیاں سنیں وہ تاریخ کا ایک نیا شعور اور جغرافیائی معلومات کا ایک نادر خزانہ لے کر واپس ہوا۔ یہ عجیب بات تھی کہ کالے خاں' رفیا اور علن ایک بھی تھے اور الگ الگ بھی تھے وہ ترقی پسندوں سے اس لحاظ سے بہر صورت مختلف تھے کہ ایک ہی ہتھیلی کے چٹے پٹے ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی شخصیتوں میں اور اپنے انداز فکر میں اپنی اپنی انفرادیت قائم رکھی تھی۔ رفیا جذب دروں کا قایل تھا۔ ہر بات پوری شدت سے محسوس کر کے کہتا تھا۔ علن کا شمار اہل خرد میں ہونا چاہیے جو ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ ایک محسوسات کا بادشاہ تھا دوسرا معقولات کا حلقہ بگوش تھا اور وہ تیسرا شخص کالے خاں کی شان جلالی کا مظہر تھا اور ذوق یقین کی دولت سے مالا مال تھا۔ پھر ان کی دلچسپیاں بھی جدا جدا تھیں۔ رفیا دلی کا دیوانہ تھا۔ کالے خاں پشاور پہ فدا تھا۔ علن انگریز کے نام کا عاشق تھا۔ اس نے انگریز کی آخر دم تک حمایت کی۔ لیکن اگر انگریز کی عقل ہی گدی کے پیچھے جا لگی تھی۔ اور وہ خواہ مخواہ ہندوستان سے دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا تو علن آخر کیا کر لیتا۔ اس نے اپنی سی بہت کی اور رفیا کے ان سارے بیانات کی جو وہ انگریزوں کی مخالفت میں دیتا تھا تردید کرتا رہا۔

رفیا نے اخبار اور سپو میاں کا حوالہ دے کر علن کو وقتی طور پر لاجواب ضرور کر دیا تھا۔ لیکن کالے خاں کی طرح وہ بے دال کا بودم تو نہ تھا۔ کہ بے سوچ بچار کئے اس کی بات مان لیتا۔ اس روز اس نے دن بھر اس مسئلہ پر غور کیا اور سارے سیاسی حالات کا تفصیل سے جائزہ لے ڈالا۔ اور آخر معاملہ کی تہہ تک پہنچ ہی گیا۔ شام کو جب چوکڑی جمی تو سب سے پہلی بات جو علن نے کی وہ یہی تھی۔ یہ وقعی حیرت کی بات ہے کہ دو پہر بھر اس نے کیسے ضبط کیا تھا۔ رفیا کو مخاطب کر کے بولا۔ ''رفیا بے کھل گئی بات۔''

رفیا کے کان کھڑے ہوئے۔ کالے خاں بھی چونک پڑا۔ ''کیسی بات؟''

''بس کھلی گئی بات۔ یار جی بھی اڑتی چڑیا کو پہچانتے ہیں۔''

رفیا کے لہجہ میں اک ذرا گرمی پیدا ہوئی۔ ''ابے بھتنی کے بات تو بتا۔ خوامخواہ دون کی لے رہا اے۔''

اوراب علن سنبھل کر بولا۔ ''یار وہی انگریز کی بات۔ بچو تم نئیں جانتے وسے۔ میں جانوں ہوں۔ بہت اڑنگے باز ہے سالا۔''

''مگر پیارے اب تو وس کی ساری اڑنگے بازی دھری رہ گئی۔ منٹوں میں بستر بوریا بندھ گیا۔''

علن تڑپ کر بولا۔ ''یار تو بالکل ڈیوٹ ہے۔ قسم اللہ پاک کی انگریز بہت چار سو بیس ہے۔ وس نے دونوں کے ایسا سنبھال کے چونا لگایا ہے کہ بیٹا کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔''

''کیا چونا لگایا ہے؟'' رفیا تو خیر چونکا ہی تھا۔ کالے خاں بھی گوش برآواز ہو گیا۔

''دیکھو نا ہندو مسلمانوں میں جو لڑائیاں ہو رئی ہیں۔'' علن کے چہرے پر ایسی سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ گویا وہ کوئی بہت بڑا راز افشا کر رہا ہے۔ ''یہ لڑائیاں انگریز کرا رہا ہے۔''

''ہٹ بے۔'' رفیا نے حقارت آمیز انداز میں اسے جھڑک دیا۔

یہ بات اتنی مضحکہ خیز تھی کہ کالے خاں کو بھی اس کا یقین نہ آیا۔ بولا ''ابے سالے علن تو تو جھوٹ کے گولے لڑھکاوے ہے۔''

''اچھا تو مت مانو۔ ایک دن خود مان لوگے۔ کہ نائی نائی بال کتنے۔ کہ جی ججمان جی آگے ہی جو آئے جاوے ہیں۔ تو جی ہم بھی یہیں ہیں تم بھی یہیں ہو۔ دیکھ لینا کیا ہوتا ہے۔ پھر ہم پوچھیں گے کہو بچو کیا کہتے ہو۔''

''کیا ہوگا بے؟'' رفیا نے بظاہر اپنے حقارت آمیز انداز کو برقرار رکھا تھا۔ لیکن دراصل وہ یہ جاننا بھی چاہتا تھا کہ علن مستقبل میں کیا نظر آ رہا ہے۔

علن نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''جب اچھی طر لڑائی ہو لے گی۔ تو انگریز ہندوؤں' مسلمانوں دونوں کو بلائے گا کہے گا۔ میاں کس برتے پر تتا پانی۔ حکومت تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ پھر دونوں کو ٹھوکر مار کے کہے گا۔ ہٹو جی ہندوستان' پاکستان دونوں ختم بس ہم حکومت کریں گے۔''

''وا بے مرغی کے۔'' رفیا بے ساختہ بول اٹھا۔ ''ہندوستان پاکستان دونوں ختم۔ منہ دھو کے آنا۔''

کالے خاں کو بھی شہ ملی۔ بولا۔ استاد میں ہندوستان کی تو کہتا نئیں ہوں۔ وے ہے بنیا۔ مگر پاکستان سے اکڑ تکڑ کی تو وہ اس سالے انگریز کا مار مار کے بھس بھر دے گا۔''

رفیا نے بہت زور شور سے تائید کی۔ ''پیارے پاکستان اب وس کے جھانسے میں نئیں آتا۔ صاف ہری جھنڈی دکھا دے گا۔ اور یو سالے اپنے کرموں کو روئیں گے۔''

اس دوران میں شیر و پلہ دار بھی موقعہ واردات پہ آ پہنچا تھا۔ چند منٹ تک تو اس نے یہ باتیں سنیں اور پھر اس انداز سے گفتگو میں کھنڈت ڈالی گویا اسے اس پورے قضیے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بولا۔ ''لاؤ خلیفہ ذریوں بیڑی پلاؤ۔''

شیرو نے بیڑی کا بنڈل کھول کر ایک بیڑی نکال کر ہونٹوں میں تھامی اور بولا۔ ''انگریز سالا تو جا ہی ریا اے۔ پر ایک بات بتائے دوں ہوں'' اور اس نے بڑے اطمینان سے اپنی بیڑی جلی ہوئی رسی سے لگا کر سلگانی شروع کر دی۔ رفیا کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ علن کو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی بات انگریز کے خلاف اس کے منہ سے نہ نکل جائے۔ کالے خاں کو سو فیصدی یقین تھا کہ شیرو جو کہے گا پاکستان کے حق میں کہے گا۔ شیرو جب بیڑی سلگا چکا تو اس نے اطمینان سے ایک زور کا کش لیا اور چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ ''بڑا خون خرابا ہوگا۔''

شیرو کے فقرے نے خاطر خواہ اثر کیا۔ سارے چہروں پر سنجیدگی کی فضا طاری ہوگئی۔ مگر علن اس کا مطلب کچھ اور ہی سمجھا۔ بولا۔ ''ہاں جی انگریز کے پاس مشین گن ہے۔ ایک ایک کو بھون ڈالے گا۔''

شیرو بھنا کر بولا۔ ''سالے انگریز کو گولی مارو۔ میں کہہ ریا اوں۔'' اور یکا یک اس کی آواز میں سرگوشی کا سا انداز پیدا ہوگیا۔ ''ہندو نے بڑی تیاریاں کی ہیں۔''

کالے خاں نے بڑے حقارت آمیز انداز میں جواب دیا۔ ''شیرو سالے تیری تو ابھی سے میا مرگئی۔ تیاریاں کرلی ہیں کر لینے دے اپنے ٹھینگے سے۔ سالوں نے کالے خاں کو نئیں دیکھا ہے۔''

شیرو خاموش ٹکٹکی باندھے کالے خاں کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ کالے خاں اچھا جانئیں کہتا بڑا خون خرابا ہوگا کالے خاں۔''

شیرو نے زور سے بیڑی کا کش بھرا اور دوکان سے خاموش آگے بڑھ گیا۔

اس روز سبطین کی بیٹھک میں اتنے لوگ جمع تھے کہ ایک اچھا خاصا سیاسی جلسہ منعقد کیا جا سکتا تھا۔ مجمع کرنے اور باتیں گھوٹنے کا چسکا سبطین کو 'انقلاب' کے بند ہوجانے کے بعد لگا تھا۔ اس زمانے میں تو اخبار کا اتنا کام تھا کہ سر اٹھانے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی۔ پھر یہ کہ دل کا غبار اخبار کے ذریعہ نکلتا رہتا تھا۔ خیالات کا طوفان امنڈا' جی بھاری بھاری ہوا' اداریہ یہ لکھ ڈالا' طبیعت ہلکی ہوگئی۔ اخبار بند ہوجانے کے بعد طبیعت ہلکی ہونے کا یہ راستہ مسدود ہوگیا۔ لیکن سینے کا طوفان اپنے اخراج کے لیے خود کوئی نہ کوئی رستہ پیدا کر ہی لیتا ہے۔ قلم نہیں چلتا تو زبان چلتی ہے۔ زبان نہیں چلتی تو دوسرے اعضا حرکت میں آتے ہیں۔ زندگی بہر صورت حرکت ہے ''انقلاب'' بند ہوا۔ اس کے بند ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی انقلابی عوامی تحریک ٹھپ ہوئی۔ اس کے ٹھپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبطین کی